Al-Qawārīr - Vol: 04, Issue: 03,
April – June 2023

OPEN ACCESS
Al-Qawārīr
pISSN: 2709-4561
eISSN: 2709-457X
Journal.al-qawarir.com

فرد کی شخصیت سازی میں ماں کا کردار اور عصری تحدیات: سیرت النبی ﷺ کی روشنی میں

Mother's role in personality development and contemporary challenges: In the light of Prophet's biography

Dr. Hafsa Nasreen
Assistant Professor,
Department of Urdu Encyclopaedia of Islam,
University of the Punjab, Lahore

Version of Record
Received: 11-April-23 **Accepted**: 02-May-23
Online/Print: 20- Jun -2023

ABSTRACT

This paper deals with mother's role in personality development of an individual and some contemporary challenges in this regard. A child's personality is shaped by people close to them but mother plays most important role. She is responsible for the physical and mental health of a child, his character traits, his well being, his habits etc. She instills the values in child's mind. In other words she shapes the future of a nation. So she should be a good role model, love her children and show affection with them, make the home a safe heaven for them ... etc. To raise healthy (mentally and physically), strong, active, brilliant and visionary children is the basic and most important duty of a Muslim mother. Different aspects of a mother's role, her duties and some contemporary challenges are being discussed in this paper.

Keywords: *Mother's role, personality development, character traits*

ابتدائیہ

گھر فرد کی تربیت و کردار سازی کے لیے اوّلین تعلیمی و تربیتی ادارے کی حیثیت رکھتا ہے۔ کردار سازی کا عمل بچپن میں نہ صرف شروع ہو جاتا ہے بلکہ جدید نفسیات کے مطابق اس کی اساس ابتدائی سات سالوں میں بن جاتی ہے۔ اس کے بعد اس میں بذریعہ تربیت کچھ تغیّر و تبدّل کیا جا سکتا ہے لیکن بچپن کی یہ گہری چھاپ کاملاً ختم نہیں ہو سکتی۔ ان اوّلین سال ہائے حیات میں بچے کے انس و محبت اور قربت کا مرکز اس کی ماں ہوتی ہے۔ بنابریں تاریخ عالم شہادت دیتی ہے کہ قوموں کی تاریخ، ان کا ماضی، حال اور مستقبل ماؤں کا ہی فیضان ہے۔ اوراق تاریخ کی روشنی میں ہم مشاہیر عالم، بالخصوص اپنے اسلاف کی زندگیوں پر ان کی ماؤں کے

CC BY

فرامین، ان کی تربیت کے گہرے اثرات کا مشاہدہ بآسانی کر سکتے ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کی پھوپھی حضرت صفیہ ؓ کی مثال لیجیے۔ انھوں نے اپنے بیٹے زبیر ؓ بن العوام کی تربیت میں اس قدر سختی سے کام لیا کہ ناظرین کو گمان ہوتا یہ بچے کو مار ہی ڈالیں گی۔ لیکن اسی سخت تربیت کا ثمرہ تھا کہ حضرت زبیر ؓ بہت سخت جان اور قوی ہو گئے تھے۔ بچپن ہی میں بڑے مردوں سے مقابلہ کرنے لگے تھے۔ ایک بار مکہ میں ایک جوان آدمی سے مقابلہ پیش آیا انھوں نے ایسا ہاتھ مارا کہ اس کا ہاتھ ٹوٹ گیا۔ لوگ اسے لاد کر شکایۃً حضرت صفیہ ؓ کے پاس لائے تو انھوں نے پہلا سوال یہی پوچھا کہ تم نے زبیر ؓ کو کیسا پایا بہادر یا بزدل۔ یہ تربیت ہی کا فیضان ہے کہ سات سالہ بچہ ڈاکوؤں کو خود اپنے پاس پوشیدہ رقم کے بارے میں بتاتا ہے اور ان کی حیرت و استفسار پر بتاتا ہے کہ میری ماں نے مجھے سچ بولنے کا حکم دیا ہے۔ سر سید کی والدہ گھر کی ملازمہ سے تلخ کلامی پر سر سید کو گھر بدر کر دیتی ہیں کہ مزاج میں رعونت پیدا نہ ہو۔ اسی تربیت کو اقبال یوں خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں:

تربیت سے میں تیری انجم کا ہم قسمت ہوا
گھر میرے اجداد کا سرمایۂ عزت ہوا

تاریخِ اسلام ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ ایک باکردار اور مخلص فرد کو پروان چڑھانے کی اوّلین ذمہ داری اس کی ماں کی ہوتی ہے۔ افراد کا مجموعہ معاشرہ بنتا ہے۔ گویا معاشرے کی مجموعی اٹھان بلاشبہ ماں ہی کے ہاتھ میں ہے بلکہ ایک تہذیب، ایک قوم کا مزاج وہی ماں بناتی ہے جو بچے کو پروان چڑھاتی ہے۔

عصرِ حاضر میں، جو ہر لحاظ سے بہت پر فتن ہے، ماں کی یہ ذمہ داری اور بھی بڑھ گئی ہے۔ تاہم اس دور میں ماں کے لیے صحیح خطوط پر تربیتِ اولاد دشوار اور پیچیدہ تر عمل بنتا جا رہا ہے۔ اس کے اسباب میں ناساز گار ماحول اور معاشرے کا بہت حد تک غیر اسلامی بنیادوں پر متشکل ہونا تو ہے ہی تاہم اس میں داخلی کمزوریاں بھی بہت زیادہ ہیں مثلاً ماں کی اپنی تربیت اسلامی اصولوں کے مطابق نہیں ہو رہی۔ اس کی اپنی شخصیت اتنی مضبوط نہیں اور اس کی زندگی مقصدیت کی حامل نہیں ہے۔ اس کے پاس مستقبل کا کوئی واضح نقشہ، کوئی منصوبہ ہی نہیں ہے۔ اس کی مصروفیت کے لیے اب اتنے مشاغل موجود ہیں کہ بچے کو دینے کے لیے وقت ہی نہیں ہے مثلاً سوشل میڈیا۔ بنابریں آج ماؤں کا اصل میدانِ عمل ان کی توجہ سے یکسر محروم ہوا چلا جا رہا ہے۔ نوجوان نسل بلکہ تمام افرادِ معاشرہ کا عمومی مزاج، ان کے طور طریقے، ان کے رجحانات اور سب سے بڑھ کر اپنے عقائد و اپنی اقدار کے حوالے سے تلوّن اور اس پر مستزاد تشکیک اس امر کا کافی و شافی ثبوت ہے کہ فرد کی تربیت و کردار سازی کا یہ اوّلین ادارہ اضمحلال کا شکار ہو چکا ہے اور اس کا نتیجہ بالفاظ رومی

خشت اول چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج

ہمارے سامنے ہے۔ معاشرے کے حالات زبانِ حال سے اس کی شہادت دے رہے ہیں۔ مقالہ ھٰذا میں اسی اہم نکتے پر بحث کی گئی ہے کہ ایک فرد کی شخصیت و کردار سازی میں ماں کا کردار کیا ہے۔ اس امر کی ادائی میں کون سی تحدّیات درپیش ہیں۔ مقالہ ھٰذا ابتدائیے کے بعد دو اجزاء میں منقسم ہے۔

حصّہ اوّل بعنوان: شخصیت سازی میں ماں کے کردار کا جائزہ تاریخی تناظر میں
حصّہ دوم بعنوان: تربیت اولاد میں ماں کو درپیش تحدیات
آخر میں تجاویز و سفارشات پیش کی گئی ہیں۔

جزو اوّل: فرد کی شخصیت سازی میں ماں کا کردار

انسانی نسل میں عورت کا کردار ماں کی حیثیت سے بے حد بنیادی ہے۔ ماں گویا نسل انسانی کے لیے شیرازہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ ماں کا وجود نہ ہو تو زندگی کے تمام اوراق منتشر ہو جائیں گے[1] کیونکہ ماں بچے کی شخصیت سازی کا فریضہ انجام دیتی ہے۔ شخصیت فرد کے ذہنی، جسمانی، شخصی برتاؤ، رویوں، اوصاف اور کردار کا نام ہے۔ یہ انسان کی ظاہری و باطنی صفات، نظریات، اخلاقی اقدار، افعال و اعمال، جذبات و احساسات پر محیط ہے[2]۔

بچہ دنیا میں ظہور سے قبل ایک معقول مدت، حالت جنین میں، اپنی ماں کے ساتھ گزارتا ہے۔ جدید سائنسی تحقیقات کے مطابق اس دوران ماں کی سوچ، اخلاق، رویّہ بچے پر گہرے اثرات مرتب کرتے ہیں۔ وہ انھی کا عکس ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہودیوں کے ہاں آج بھی یہ معمول ہے کہ شوہر اپنے کام کاج سے رخصت لے کر حاملہ بیوی کے ساتھ وقت گزارتا ہے۔ دونوں مل کر مختلف علوم و فنون پر بآواز بلند گفتگو کرتے ہیں۔ بالخصوص ریاضی کے مشکل سوال حل کرتے ہیں۔ ایسی مشقیں کرتے ہیں جن سے بچے کی دماغی قوت و طاقت میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس معمول سے بچے کی شخصیت، جو اس کی ظاہری و باطنی صفات، نظریات، اخلاق و کردار، افعال، احساسات و جذبات کا مجموعہ ہے، پر گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ گویا ولادت سے قبل ماں کے خیالات، احساسات، رویے، معمولات بچے کی شخصیت کی بناڈالتے ہیں۔ جس قالب میں ماں باپ اسے ڈھالنا چاہتے ہیں اس کا آغاز ہو جاتا ہے۔ پھر دنیا میں آنے کے بعد یہی ماں اس بچے کے لیے اوّلین درس گاہ اور اوّلین ادارہ ہوتی ہے۔ جو اس بچے کی لوح قلب و ذہن پر لمحہ کچھ نئے نقوش ثبت کرتی چلی جاتی ہے۔ بقول بعضے "بچہ ایک سادہ تختی ہوتا ہے جس پر ہر روز اس کے والدین کچھ نہ کچھ لکھتے ہیں۔" اور ماں سے چونکہ بچے کا تعلق ابتدا ہی سے بہت گہرا ہوتا ہے تو اس تحریر میں اس کا حصہ اور بھی زیادہ ہوتا ہے۔ آنجنابؐ کا فرمان ہے:

كلكم راعٍ وكلكم مسئول عن رعيته۔[3]

"تم میں سے ہر کوئی نگران ہے اور اس سے اس کی رعیت کی بابت سوال کیا جائے گا۔"

اسی طرح فرمایا: "....اور عورت اپنے گھر کی نگران (راعیۃ) ہے اس سے گھر اور بچوں کی بابت سوال کیا جائے گا.... تو ان سوالوں کے جوابات کے لیے مستعد ہو جاؤ۔ [صحابہ نے] پوچھا یارسول اللہ: ان کا جواب کیا ہو گا؟ فرمایا: "اعمال صالح"۔[4]

راعٍ کے لغوی معنی چرواہے کے ہیں جو بکریوں کو چراتا، ان کے رزق کا بندوبست کرتا، ان کا تحفظ یقینی بناتا اور ان کو گمراہ ہونے سے بچاتا ہے"[5]۔ سو مسؤلیت کا یہ دائرہ بہت وسیع ہے۔ ایک خاتون خانہ اور پھر ماں کی بطور راع ذمہ داریوں اور کردار کی بات ہو تو بلاشبہ یہ ایک بڑی ذمہ داری ہے کیونکہ بچہ بہت بڑی امانت ہے جو اسے سونپی جاتی ہے۔ گوشت کا ایک لوتھڑا ایک کورے کاغذ کی مانند اسے سونپا گیا ہے وہ اسے کیا بنائے گی یہ اختیار بہت حد تک اسی کے پاس ہے۔ گویا وہ اس بچے کو مستقبل میں کیسا دیکھنا

چاہتی ہے؟اس سوال کے مطابق ہی وہ اس کی ساخت و پرداخت کرے گی۔ لہٰذا اس امانت کی حفاظت و افزائش ماں کا سب سے بڑا امتحان ہے۔ راعٍ کے لغوی معنی کو ملحوظ رکھتے ہوئے ماں کی ذمہ داریوں میں بچے کی جسمانی و ذہنی حفاظت، اس کی پرورش، اس کی نشوونما بہترین اہتمام کے ساتھ وہ اس کو راہِ راست پر رکھنے کے لیے حتی الوسع کوشش و کاوش اور ہر ممکنہ اقدام بھی شامل ہے نیز اس کے مستقبل کی فکر کی بھی ذمہ دار ہے۔ اس کے عقیدے، مزاج، کردار، شخصیت کی اٹھان، اس کی عادات کی تشکیل میں ماں کا کردار اساسی نوعیت کا حامل ہے۔

اس تناظر میں ایک فرد کی شخصیت سازی میں ماں کے کردار کا جائزہ لیا جائے تو اس پر درج ذیل فرائض عائد ہوتے ہیں:

1-تصور عبدیت کے گہرے نقوش کا ارتسام

بچے کے دل و دماغ پر تاحیات وہی تحریر کالنقش فی الحجر ہوتی ہے جو صغر سنی میں لکھ دی جاتی ہے۔ بقول امام غزالیؒ "صغر سنی میں جو باتیں دل میں آئیں گی وہ بلوغ کے وقت دل پر نقش ہو جائیں گی۔ لہٰذا ابتدا ہی سے اولاد کی تربیت کرنا ضروری ہے۔ اس کا اختیار ماں باپ کو ہے کہ جس طرف چاہیں اولاد کو پھر لیں۔ اسی لیے شیخ سعدی نے فرمایا:

خشت اول چوں نہد معمار کج تا ثریا می رود دیوار کج

"یعنی جب معمار پہلی اینٹ (بنیاد) ٹیڑھی رکھ دیتا ہے تو دیوار آخر تک ٹیڑھی رہتی ہے"۔

ارشاد ربانی ہے: قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَ اَهْلِيْكُمْ نَارًا۔[6] اپنے آپ کو اور اپنے اہل خانہ کو آگ سے بچاؤ۔

مولانا مودودیؒ نے البقرۃ کی آیت تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ کا ترجمہ کیا "اپنے مستقبل کی فکر کرو"۔ اس کی تفسیر میں وہ لکھتے ہیں "جامع الفاظ میں دو معنی ہیں: ایک اپنی نسل برقرار رکھنے کی کوشش کرو تاکہ تمھارے دنیا چھوڑنے سے پہلے دوسرے تمھاری جگہ کام کرنے کے لیے موجود ہوں۔ دوسرے جس نسل کو تم چھوڑنے والے ہو اس کو دین، اخلاق اور آدمیت کے جوہروں سے آراستہ کرنے کی کوشش کرو"۔[7] اللہ تعالیٰ نے انسان کا مقصد حیات یوں بیان فرمایا ہے: وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ[8]

ماں کی اوّلین ذمہ داری ہے کہ صغر سنی ہی سے بچے کے قلب و ذہن میں عبدیت کا تصور راسخ کرلے۔ اس کا طریق کار اللہ تعالیٰ نے یعقوبؑ کے قصے میں بیان کر دیا ہے۔ حضرت یعقوبؑ کا وقت وصال قریب آیا تو اپنے بیٹے پوتے سب کو جمع کیا اور ان سے سوال کیا مَاتَعْبُدُوْنَ مِنْ م بَعْدِیْ[9] "تم میرے بعد کس کی عبادت کروگے"۔ یہی سوال ماں کو ایک مکمل نظام العمل فراہم کرتا ہے۔ "عبادت" سے مراد صرف صوم و صلوٰۃ پنجگانہ نہیں بلکہ ایک مکمل طرز حیات ہے۔ اکل و شرب، نشست و برخاست، سونا جاگنا، میل ملاقات، کسب معاش، معاشرت، غرضیکہ ہر شعبہ حیات اس کے دائرے میں آتا ہے۔ عبادت میں صرف سر جھکانا، سجدہ کرنا یا نماز پڑھنا ہی نہیں بلکہ اس کے معنی ہیں اطاعت مطلقہ، خدائے وحدہ لاشریک لہ کے حکم پر چلنا اور اس کے اشارے کو دیکھنا اس کے قانون کو ماننا[10]۔

لیکن اولاد سے یہ سوال پوچھنے کی نوبت تب آتی ہے جب خوب وزشت کے مطلوب و مقصود پیمانوں کے مطابق تربیت کی ہو۔ یہی ماں کی اولین ذمہ داری ہے۔ عبدیت کا یہ تصور بہت محنت کا متقاضی ہے۔

اس سلسلے میں حضرت یعقوبؑ ہی کا طرزِ عمل بتایا گیا:

وَ وَصّٰی بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِیْهِ وَ یَعْقُوْبُ یٰبَنِیَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰی لَكُمُ الدِّیْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ[11]

یعنی اولاً اولاد کو اللہ کے مطلوب و مقصود طرز عمل کے مطابق زندگی بسر کرنے کی تلقین و ترغیب دو، اس کا عملی نمونہ پیش کیا۔ ازاں بعد ان سے یہ سوال پوچھا کہ لما تعبدون من بعدی۔ لہٰذا ماں کی اوّلین ذمہ داری ہے کہ بچپن ہی سے بچے کو اللہ سے متعارف کرائے۔ اسے اس کے خالق سے متعارف کرائے اس کی عطاؤں و انعامات کا احساس دلائے اور اسی اعتبار سے مسئولیت وجوابدہی کا تصور بھی پیدا کرے۔ بچے کے حوالے سے اس کی فکر و سوچ کا محور یہ ہونا چاہیے کہ یہ بچہ جوان ہو کر کیسا ہو گا۔ کیسے کام کرے گا اور عمر کے ساتھ ساتھ اس کی شخصیت کیسی ہوتی جائے گی۔ اس کے معاملات کیسے ہوں گے؟ بالفاظ ابوالحسن علی ندوی "آپ کے پاس جو وسائل و امکانات ہیں ان سب کو اس مقصد کے حصول کے لیے استعمال کریں کہ یہ خدائے واحد کے پرستار ہوں اور مختصر لفظوں میں صحیح مسلمان ہوں۔ مؤحد، اس زندگی کے بعد دوسری زندگی پر ایمان رکھتے ہوں"۔[12]

اس ضمن میں اوّل کام تو یہ ہے کہ بچپن ہی سے اسلام کی مبادیات بچے کو سکھائی جائیں۔ بار بار بنیادی تصورات اسلام کا استحضار ہو۔ ثانیاً گھر کا ماحول بچے کو دی جانے والی تعلیم کا نمونہ ہو۔ ماں خود احکام شرعیہ کی عامل ہو۔ کیونکہ بچے بسرعت وہ عمل سیکھ لیتے ہیں جس پر اپنے والدین، بالخصوص ماں کو عمل پیرا دیکھتے ہیں بہ نسبت اس بات کے جو ان کو سکھائی جاتی ہے۔

2- فضائل اخلاق کی تخم ریزی

بچے میں فضائل اخلاق کی تخم ریزی بلاشبہ ماں ہی کر سکتی ہے۔ گو انسان ساری عمر اخلاقی صفات اپنی شخصیت کی تزئین شعوری طور پر کر سکتا اور کرتا ہے لیکن اس عمل کی بِناماں ہی ڈالتی ہے۔ سو ماں کا فرض ہے کہ بہت محبت و عاطفت سے بچے کی پرورش کرے۔ اسے پورا وقت دے صبر کا مظاہرہ کرے بچے ماں ہی سے رشتے نبھانا سیکھتے ہیں۔ مل کر رہنا اور محبت کرنا سیکھتے ہیں۔ امانت، دیانت، صدق و ایضا کی خوبیاں صغر سنی میں انسان کی ذات کا حصہ تبھی بن سکتی ہیں اگر ماں نے شعوری طور پر کوشش کی ہو۔ اگر کوئی آیا بچے کی تربیت کرے تو اس کی اٹھان اس اخلاقی سطح پر نہیں ہو سکتی جو ماں کے ذریعے ہو سکتی ہے[13]۔

کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

قد ینفع الاصلاح والتهذیب فی عهد الصغر والنش ءُ ان اهملته طفلاً تعثر فی الکبر

"تربیت و اصلاح بچپن کے زمانے میں نفع بخش ہوتی ہے اگر بچپن میں تربیت سے غفلت برتی جائے تو طفل بڑا ہو کر ناکام و نامراد رہتا ہے۔"

اس کے لیے اگر سختی سے کام لینا پڑے تو وہ بھی لینا چاہیے۔ فرمان رسول اکرمؐ ہے:

"علقوا السوط حیث یراه اهل البیت، فانه لهم أدب"[14]

"اپنا کوڑا ایسی جگہ لٹکا کے رکھو جہاں وہ سب گھر والوں کو دکھائی دے یہ ان کو ادب سکھانے میں معاون ہو گا"۔

مسئولیت کے فرض کی ادائی کے لیے ضروری ہے کہ ماں کی اپنی اولاد پر اتنی ہیبت تو ہو کہ وہ اولاد کو راہِ راست پر رکھ سکے۔[15]
تاریخ کے جھروکوں میں ہمیں ایسا منظر بھی ملتا ہے کہ ایک بچہ ڈاکوؤں کو اپنے پاس موجود رقم کے بارے بتا رہا ہے۔ ڈاکوؤں کے سردار کی حیرت و استفسار پر بتاتا ہے کہ ماں نے سچ بولنے کی تاکید کی تھی۔ یہی بچہ شیخ عبد القادر جیلانی کے نام سے مشہور ہوا اور بہت سوں کے لیے ہدایت و رہنمائی کا سبب بنا۔ صغر سنی میں راست گوئی کا ایسا شاندار مظاہرہ اسی لیے ممکن ہوا کہ ماں نے راست گوئی کی تلقین اور کذب بیانی سے احتراز کا حکم دیا تھا۔
ایسی ہی ایک مثال سید ابو الحسن علی ندویؒ کی ہے۔ ان کی والدہ نے والد کے انتقال کے بعد ان کی نازبرداری بھی کی لیکن ان کی تربیت کے معاملے میں بہت سختی برتی۔ بالخصوص دو معاملات میں بہت سخت تھیں۔ ایک تو ترک نماز کی بالکل اجازت نہ دیتیں یعنی سوئے ہوئے کو بھی جگا کے نماز پڑھواتی تھیں۔ دوسرے علی میاں کے کسی خادم کے لڑکے یا کام کاج کرنے والے غریب بچوں کے ساتھ کسی زیادتی یا ناانصافی کو بالکل برداشت نہ کرتیں۔ کسی سے حقارت یا غرور سے پیش آتے تو وہ نہ صرف معافی منگواتیں بسا اوقات ہاتھ تک جڑوا دیتیں۔ مولانا ابو الحسن علی ندوی لکھتے ہیں "مجھے اس میں کتنی ہی ذلت و خفّت محسوس ہوتی مگر وہ اس کے بغیر نہ مانتیں۔ مجھے اپنی زندگی میں اس کا بہت فائدہ پہنچا اور ظلم و تکبر غرور سے ڈر محسوس ہونے لگا۔ میں دل آزاری اور دوسروں کی تذلیل کو گناہ کبیرہ سمجھنے لگا۔ اس سے مجھے اپنی غلطی کا اقرار کر لینا ہمیشہ آسان معلوم ہوا[16]۔ اس انداز تربیت کے پیش نظر مولانا ابو الحسن علی ندوی نے ایک تجربہ بطور مشورہ پیش کیا ہے کہ "بچوں کی مذہبی و اخلاقی اٹھان اور ان کے اس قابل ہونے میں کہ اللہ ان سے اپنے دین کی کوئی خدمت لے یا قبولیت عطا فرمائے دو چیزوں کا بڑا دخل ہے ایک یہ کہ وہ (اپنی عمر کے مطابق) ظلم و دل آزاری سے محفوظ رہیں۔ کسی دکھے دل کی آہ یا مظلوم کی کراہ ان کے مستقبل پر اثر نہ ڈالے۔ دوسرے یہ کہ ان کی غذا غصب و حرام اور مشتبہ مال سے پاک رہے۔[17]
سر سید احمد خان نے لڑکپن میں گھر کے پرانے ملازم کو تھپڑ مارا۔ ان کی والدہ کو خبر ہوئی تو بہت ناراض ہوئیں کہا اسے گھر سے نکال دو یہ گھر میں رہنے کے لائق نہیں رہا۔ چنانچہ ایک ماما ہاتھ پکڑ کر گھر سے باہر لے گئی اور سڑک پر لا کر چھوڑ دیا۔ تین دن تک خالہ کے مکان میں چھپے رہے۔ تیسرے دن خالہ والدہ کے پاس لے گئیں تا کہ قصور معاف کروا دیں۔ انھوں نے کہا جب تک وہ نوکر سے قصور معاف نہیں کرائے گا میں معاف نہیں کروں گی۔ چنانچہ جب نوکر کے آگے ہاتھ جوڑے قصور معاف ہوا۔ اس تربیت کا اثر سر سید پر ساری عمر رہا۔ گھر اور دفتر کے ملازموں سے نہایت شفقت سے پیش آتے بلکہ اتنی مروت برتتے کہ بسا اوقات بڑے بڑے نقصانات اٹھانا پڑے۔[18]
ایسی ہی ایک مثال عبد الستار ایدھی مرحوم کی ہے۔ ان کی والدہ نے ایک خاص مشق کے ذریعے انھیں ایسا سخی اور خدا ترس بنایا۔ کہتے ہیں: "میری عادت جو بچپن سے میری ماں نے میرے اندر رچا بسا دی تھی۔ وہ ہر روز سکول جانے سے پہلے مجھے دو پیسے دیتیں لیکن اس ہدایت کے ساتھ کہ میں اس میں سے ایک پیسہ لازماً کسی حاجت مند کو دوں گا.... میں جوں ہی سکول سے واپس آ کر گھر کی دہلیز پر پاؤں رکھتا ماں مجھ سے فوراً پوچھتیں "تم نے پیسوں کا کیا کیا؟" اور میری اکھڑی اکھڑی وضاحت سنتے ہی کہتیں "خود غرض لوگ اپنے سوا کسی کو دینا نہیں جانتے"[19]۔ البتہ یہ امر نہایت اہم ہے کہ صرف تلقین ثمر آور نہیں ہو سکتی۔ بچوں کو

ماں کے اپنے معمولات حیات اسی رنگ میں رنگے نظر آنے چاہئیں جن کی وہ تلقین کرتی ہے۔ بصورت دیگر اولاد ذہنی تضاد اور تذبذب کا شکار ہو جاتی ہے۔ ماحول ہی ایسا بنانا چاہیے کہ بچے خود بخود اس سے اوصاف حمیدہ سیکھتے چلے جائیں۔

مضبوط اور سخت کوش شخصیت بنانا

شخصیت جسم وروح دونوں کا مرکب ہے۔ دونوں کی صحت، خوبصورتی اور قوت ونکھار کے لیے ہر ممکنہ اقدام کرنا ماں ہی کی ذمہ داری ہے۔ تربیت انسان کے تمام قویٰ کے تطور ونمو پر محیط ہے۔ اس میں ظاہری وحسی نمو اور بڑھوتری بھی شامل ہے اور تفکر و تدبر، سوچ اور فکر کنی بھی۔ سو یہ ایک وسیع المعانی اصطلاح ہے[20]۔ اور کسی بچے کی جسمانی فکری، ذہنی اور اخلاقی تربیت و نشوونما کی اصل بنیاد اسی دور میں ہوتی ہے جو وہ ماں کی نگرانی وتربیت میں گزارتا ہے۔ بیمار جسم کا حامل انسان مضبوط عزائم و مقاصد اور ٹھوس ارادوں کا مالک ہو ہی نہیں سکتا۔ کہتے ہیں "العقل السليم فى الجسم السليم"۔ لہٰذا بچپن ہی سے بچے کی جسمانی تربیت کا خیال رکھنا اس لیے بھی ضروری ہے کہ بچہ قوی اور سخت جان بنے۔ ماں کے لیے یہ اہتمام ضروری ہے کہ بچے کے کھانے پینے میں اعتدال وتوازن ہو۔ وہ سست نہ ہو ورزش اور بھاگ دوڑ کرتا ہو نیز اسے صاف ستھری، نفاست سے بھرپور زندگی بسر کرنے کی تربیت دی جائے۔ ایک مسلمان کو پروان چڑھایا جارہا ہے جسے اعداء کے خلاف سینہ سپر رہنا ہے تو اسے لازماً قوی الجثہ ہونا چاہیے۔ یہ دراصل ایک مضبوط امت کی بناڈالنے کے مترادف ہے۔[21]

آپؐ کی پھوپھی حضرت صفیہؓ نے اپنے بیٹے زبیرؓ بن عوام کی پرورش اسی انداز میں کی۔ وہ انھیں بہت مارا پیٹا کرتی تھیں اور سخت محنت ومشقت کراتی تھیں۔ ایک دفعہ نوفل بن خویلد نے جو اپنے بھائی کی وفات کے بعد ان کے ولی تھے، حضرت صفیہؓ پر بہت خفا ہوئے کہ تم بچے کو مار ہی ڈالو گی اور بنوہاشم سے کہا تم لوگ صفیہؓ کو سمجھاتے کیوں نہیں۔ حضرت صفیہؓ نے حسب ذیل رجز میں اس کا جواب دیا

من قال الى ابغضه فقد كذب اغا اضربه لكى يلب

"جس شخص نے یہ کہا کہ میں اس سے بغض رکھتی ہوں اس نے جھوٹ کہا میں اس کو اس لیے مارتی ہوں کہ عقل مند ہو"

ويهزم الجيش و يأتى بالسلب... "اور فوج کو شکست دے اور مالِ غنیمت حاصل کرے"[22]

اسی تربیت کا نتیجہ تھا کہ صغر سنی میں ہی بہت طاقت ور اور سخت جان تھے۔ بڑے بڑے مردوں کا مقابلہ کر لیا کرتے تھے۔

سطور بالا میں ذکر کیا جاچکا ہے کہ جدید سائنسی تحقیقات کے مطابق انسان اپنے ماحول کا اثر اس وقت سے قبول کرنے لگتا ہے جب وہ جنین کی صورت ہوتا ہے۔ اگر اس کی ماں خوش کن آوازیں سنتی اور حالتِ نشاط میں رہتی ہے تو جنین بھی خوش ہوتا ہے۔ اگر ماں اضطراب ورنج کی کیفیت میں ہے تو جنین کا رجحان رونے کی جانب ہو جاتا ہے وہ افسردہ دل رہتا ہے[23]۔ لہٰذا ماں کے لیے لازم ہے کہ حالات جیسے بھی ہوں اپنے بچے کے مستقبل کی خاطر فکر وسوچ اور رویے کو مثبت رکھے تاکہ بچہ مغموم نہ ہو۔ کیونکہ مغموم، متذبذب اور مضطرب رہنے والا انسان قوی اعصاب کا مالک اور ٹھوس فیصلے کرنے والا ہو ہی نہیں سکتا[24]۔ اور نتیجتاً اپنی عملی زندگی میں کسی کار عظیم کی انجام دہی نہیں کر سکتا۔ اسی لیے ماں کو امام غزالیؒ ہدایت کرتے ہیں: "ماں کو چاہیے بچے کو دن میں سونے کی عادت نہ ڈالے کیونکہ اس سے سستی پیدا ہوتی ہے۔ رات کو سلائے لیکن نرم بستر نہ دے تاکہ بدن سخت رہے۔

آرام طلب نہ ہو۔ مکتب سے آنے کے بعد اس کو کسی اچھے کھیل کی اجازت دینی چاہیے۔ جس سے مکتب کی مشقت سے راحت ملے مگر کھیل بھی اتنا نہ کھیلے کہ تھک جائے۔ اگر کھیل کی اجازت نہ ہو اور تعلیم میں ہمیشہ سختی برتی جائے تو بچے کا دل مرجھا جاتا ہے۔ طبیعت میں تیزی رہ جاتی ہے اور زندگی تلخ ہو جاتی ہے حتیٰ کہ وہ ایسا حیلہ ڈھونڈنے لگتا ہے جس سے بالکل کچھ بھی نہ سیکھے[25]۔

اگر ماں بچے کو بے جا لاڈ پیار میں سخت کام کرنے یا پر مشقت کھیل کھیلنے سے روک رکھتی ہے تو در حقیقت وہ اس کے ساتھ ظلم کرتی ہے کیونکہ اس طرح ضعیف الارادۃ، کمزور و ناپختہ فکر کا حامل رہ جاتا ہے[26]۔ تاہم جسمانی اعتبار سے سخت کوش ہونے کے ساتھ ساتھ ذہنی طور پر مضبوط ہونا بھی ضروری ہے۔ بچے میں اتنی قوت برداشت اور طاقت صغر سنی ہی سے پیدا کرنے کی سعی کرنی چاہیے کہ وہ اپنی زندگی میں حادثات و مصائب کو سہہ پائے اس کے حواس مختل نہ ہو جائیں۔ یہ عنصر ماں کی شعوری کوشش کا لازمی حصہ ہونا چاہیے۔ اس کا ایک نہایت مؤثر طریقہ ابوالحسن علی ندوی کی سوانح سے ملتا ہے۔ لکھتے ہیں: "اس زمانے میں ہمارے خاندان میں ایک بہت اچھا دستور تھا کہ جہاں کوئی ایسا غم ناک واقعہ پیش آجاتا۔ دل دکھے ہوئے ہوتے یا کوئی پریشانی کی بات ہوتی تو مصام الاسلام سنی جاتی... صحابہ کرام اور مجاہدین کے غم کے سامنے آدمی اپنا غم بھول جاتا ہے۔ میری بڑی خالہ مرحومہ جو حافظہ بھی تھیں، منظوم فتوح الشام بڑے پر اثر و دلکش لہجے میں پڑھتی تھیں۔ عموماً یہ مجلس عصر کے بعد ہوتی بچے کبھی اپنی ماؤں کے پاس کھیلتے یا کسی پیغام کے لیے آتے اور بے ارادہ ٹھہر کر کچھ دیر سن لیتے یا پھر کبھی باارادہ بیٹھتے اور کبھی مائیں اپنے پاس بٹھا کر سننے کا موقع دیتیں۔[27]

بچے سے پیار محبت کا اظہار

محبت کا احساس دلانا بچے کو مضبوط بناتا ہے۔ اس کی شخصیت کو مکمل بناتا ہے۔ **موازنے سے گریز:** ایک بچے کا کسی دوسرے بچے سے خواہ وہ اس کا سگا بھائی یا بہن ہی کیوں نہ ہو۔ موازنہ قطعاً نہیں کرنا چاہیے۔ یہ بچوں میں احساس کمتری اور نفسیاتی مسائل کو جنم دینے کا سبب بنتا ہے۔ بچوں کے مابین عدل و انصاف، امتیازی سلوک بھی بچے کی شخصیت کو متاثر کرتا ہے لہٰذا کسی ایک سے برتر اور دوسرے سے کمتر سلوک نہیں کرنا چاہیے۔ فرمانِ رسولِ اکرمؐ ہے: اعدلوابین ابنائکم، اعدلوابین ابنائکم اعدلوا بین اولادکم[28]۔ اسی طرح بچیوں کو بچوں سے کم تر سمجھنا اور لڑکوں کو ترجیح دینا بہت سے ذہنی مسائل، حسد و رقابت جیسے منفی جذبات کو جنم دیتا ہے جس سے شخصیت مجروح ہوتی ہے[29]۔

بچوں کو موازنے سے بچانا

بچوں کی تربیت اس نہج پر نہایت حکمت کے ساتھ کی جانی چاہیے کہ اِن میں دوسرے سے اپنے موازنے اور مقابلے کا جذبہ جنم نہ لے۔ وہ اپنی ذات میں مطمئن ہوں نیز انھیں موجود پر اتنا شاکر و صابر رہنے کی تربیت دی جائے کہ مفقود کا صدمہ و رنج نہ کرے وہ نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہونے کے بجائے مطمئن و خوش گوار زندگی بسر کر سکے۔

4- بڑے مقاصد کے لیے ذہن سازی

اوائل عمر ہی سے ایک بڑے مقصد حیات کا تصور اور اس کے حصول کے لیے ہر ممکنہ کوشش کے جذبے کا بیج ماں ہی ڈالتی ہے۔ پھر اس کی آبیاری بھی ایک عمر تک ماں ہی کر سکتی ہے۔ سو لازم ہے وہ اپنے بچے کو زندگی میں کسی بڑے مقصد کے لیے تیار کرے۔

صدر اسلام سے عہد حاضر تک اس کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں کہ کیسے ماؤں نے اپنے بچوں کو ذہن سازی کی جس کے مطابق ان کے بچوں نے کیسے کیسے کارہائے نمایاں انجام دیے اور کیسی کیسی قربانیاں دیں مثلاً غزوہ احد میں پینتالیس سالہ ام عمارہ زخمیوں کی مرہم پٹی کا فریضہ انجام دے رہی تھیں۔ خود بھی کافی زخمی ہوئیں۔ اسی دوران ان کے بیٹے عبد اللہ بن زید کے بازو میں زخم آگیا۔ حضرت ام عمارہؓ نے اپنی کمر سے کچھ کپڑا نکالا پٹی باندھی اور بجائے بیٹے کو آرام کا مشورہ دینے کے کہا جاؤ بیٹا کافروں سے مقابلہ کرو۔ نبی کریم ﷺ نے اس منظر کو دیکھا تو ام عمارہ کو بہت دعائیں دیں اور فرمایا ام عمارہ اتنی ہمت کون رکھتا ہو گا جتنی تو رکھتی ہے"۔[30]

حضرت خنساءؓ صحابیہ اور اپنے زمانے کی معروف شاعرہ خاتون تھیں۔ انھوں نے ساری عمر اپنے دو بھائیوں کے، جو داغ مفارقت دے گئے تھے، مرثیے کہے۔ ان کا دیوان ان بھائیوں کے لیے کہے گئے مرثیوں سے بھرا ہوا ہے۔ ایسا دردمند دل رکھنے والی خاتون ہیں۔ قادسیہ کا معرکہ درپیش ہے اپنے بیٹے کو بلاتی ہیں اور کہتی ہیں بیٹا جاؤ میں نے تم کو اسی دن کے لیے پالا تھا۔ جاؤ اللہ کے راستے پر جان دے دو۔ پھر دوسرے کو بلاتی ہیں اور یہی کہہ کر بھیجتی ہیں پھر تیسرے کو بلاتی ہیں پھر چوتھے کو اور جب سب کی شہادت کی خبر آتی ہے تو کہتی ہیں: الحمدللہ الذی اکرمنی بشھادتھم۔[31]

اعلیٰ مقاصد کی حامل ماں اور بیٹے کی ایک اور مثال ملاحظہ ہو۔ حضرت عبد اللہ بن زبیر اپنی شہادت سے چند گھنٹے قبل حضرت اسماء کی خلافت میں حاضر ہوئے۔ حضرت اسماءؓ نے پوچھا عبد اللہ اس وقت جب حجاج کی قلعہ شکن توپوں کی سنگ باری سے، جو وہ حرم میں پناہ گزین تمھارے آدمیوں پر کر رہی ہیں، مکے کے در و دیوار لرز رہے ہیں تم کس غرض سے آئے ہو؟ جواب دیا: امی جان کچھ مشورے کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ حضرت اسماء نے تعجب سے کہا: مجھ سے مشورہ لینے آئے ہو؟ کس معاملے میں؟ جواب دیا میرے کچھ ساتھی ایک ایک کر کے مجھ سے بچھڑ گئے حجاج کے خوف سے یا پھر مادی فوائد کے حصول کے لیے۔ چند جانثار جو ابھی باقی ہیں ان کا بھی یہ حال ہے کہ جب قوت برداشت ساتھ چھوڑ دے گی تو ساتھ چھوڑ دیں گے۔ ادھر بنو امیہ کے قاصد برابر مجھے پیش کش کر رہے ہیں کہ ہتھیار ڈال دوں اور عبد المالک بن مروان کی بیعت کر لوں تو میرا ہر دنیاوی مطالبہ مانیں گے۔ حضرت اسماء نے جواب دیا عبد اللہ یہ تمھارا اپنا معاملہ ہے تم خود اپنے بارے میں بہتر جانتے ہو۔ اگر تمھیں اپنے مؤقف کی صداقت اور حق پر ہونے کا یقین ہے تو ڈٹے رہو اور اپنے ساتھیوں کی طرح جنھوں نے تمھارے جھنڈے تلے جانیں دی ہیں استقامت اختیار کرو۔ اگر تم ان کے ذریعے دنیا حاصل کرنا چاہتے تھے تو تم بہت برے آدمی ہو کہ خود کو بھی ہلاک کیا اور اپنے ساتھیوں کو بھی۔ عرض کیا اس صورت میں لازماً قتل کر دیا جاؤں گا۔ والدہ نے کہا "یہ تمھارے لیے اس سے بہتر ہے کہ تم اپنے آپ کو حجاز کے حوالے کر دو اور بنی امیہ کے لڑکے تمھارے سر سے کھیلیں۔

عرض کیا میں قتل ہونے سے نہیں ڈرتا مجھے خوف ہے کہ وہ میرا مُثلہ کر دیں گے۔ ماں نے کہا "قتل ہو جانے کے بعد کوئی چیز ایسی نہیں جس سے خوف محسوس ہو۔ بکری جب ذبح کر دی گئی تو کھال کھینچنے سے اسے کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔ یہ سن کر حضرت عبد اللہ کی پیشانی خوشی سے چمک اٹھی۔ کہا "کتنی عظیم ہیں آپ.... میں اس وقت آپ کی یہی باتیں سننے حاضر ہوا تھا رب تعالیٰ کی قسم نہ میرے حوصلے پست ہوئے ہیں نہ میرے اندر کوئی کمزوری پیدا ہوئی ہے۔ جب میں قتل کر دیا جاؤں تو میرے اوپر حزن و

ملال کے بجائے اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کر دینا۔ اس کے بعد حضرت اسماء نے بیٹے کے جسم پر رخصت کرنے کے لیے پیار سے ہاتھ پھیرا کہا عبد اللہ یہ کیا پہنے ہوئے ہو؟ کہا زرہ ہے۔ فرمایا یہ اس شخص کا لباس نہیں جو شہادت کا طالب ہو۔ اسے اپنے جسم سے الگ کر دو تمھیں تیزی سے حرکت کرنے میں آسانی ہو گی اور پوری قوت سے دشمن پر حملہ کر سکو گے اور پاجامہ پہن لو تا کہ جب تم گرو تو تمھارا ستر نہ کھلے۔ وہ کثیر فوج کے سامنے چھوٹے سے لشکر کے ساتھ لڑتے ہوئے حضرت عبد اللہ شہید ہو گئے۔ حجاج بن یوسف نے ان کی لاش کو چوک میں سولی پر لٹکا دیا۔ حضرت اسماءؓ یہاں سے گزریں بیٹے کو دیکھا تو کہا بیٹے جب تو زندہ تھا منبر پر چڑھتا تھا تو لوگوں کی گردنیں نیچی ہوتی تھیں آج مرنے کے بعد بھی تو ان سب سے اونچا ہے۔ عبد الملک کو اطلاع ملی تو کانپ گیا اور فوراً حجاج کو خط لکھ کر لاش اہلِ خانہ کو دلوائی۔[32]

ایک مثال تحریک خلافت کی اولین خاتون کارکن مولانا محمد علی کی والدہ ''اماں بی'' کی ہے۔ اماں بی نے انگریزوں سے نفرت اور اسلام کے لیے مر مٹنے کا جذبہ اپنے بچوں کی گھٹی میں ڈال دیا تھا۔ مولانا محمد علی کی اسیری کے زمانے میں ایک بار یہ افواہ پھیل گئی کہ محمد علی انگریزوں سے معافی مانگ کر آزاد ہو جائیں گے۔ بی اماں کو پتہ چلا تو کہنے لگیں ایسا نہیں ہو سکتا اور اگر ایسا ہو گیا تو میرے بوڑھے ہاتھوں میں ابھی اتنی جان باقی ہے کہ محمد علی کا گلا گھونٹ دوں۔ ایسی زندگی پر لعنت ہے جس سے اسلام کے نام پر حرف آئے۔ ایسا واضح مقصدِ حیات رکھنے والی اور اسے بچوں کے ذہن میں راسخ کرنے والی ماں ہی ایک بہترین شخصیت تشکیل دے سکتی ہے۔ انھی بی اماں کے جوش و جذبے کو ایک صاحب نے ''صدائے خاتون'' کے نام سے یوں نظم کیا:

بولیں اماں محمد علی کی — جان بیٹا خلافت پے دے دو
ساتھ تیرے ہیں شوکت علی بھی — جان بیٹا خلافت پے دے دو
ہو کبھی میرے گھر کا اجالا — تھا اسی واسطے تم کو پالا
گر ذرا سست دیکھوں گی تم کو — دودھ ہرگز نہ بخشوں گی تم کو
میں دلاور نہ سمجھوں گی تم کو — جان بیٹا خلافت پے دے دو

اور

کھانسی آئے اگر تم کو جانی — مانگنا مت حکومت سے پانی
بوڑھی اماں کا کچھ غم نہ کرنا — کلمہ پڑھ پڑھ خلافت پے مرنا
پورے اس امتحان میں اترنا — جان بیٹا خلافت پے دے دو
ہوتے میرے اگر سات بیٹے — کرتی سب کو خلافت پے صدقے
ہیں یہی دین احمد کے رستے — جان بیٹا خلافت پے دو دو[33]

گذشتہ صفحات میں فرد کی شخصیت سازی میں ماں کے کردار کے اساسی پہلوؤں کا تذکرہ مجملاً کیا گیا ہے۔ تاہم عصر حاضر میں ماں کو یہ کردار ادا کرنے میں متعدد تحدیات کا سامنا ہے۔ حصہ دوم میں ان تحدیات یعنی مسئلے اور اس کے حل پر بات کی جائے گی۔

حصہ دوم: فرد کی شخصیت سازی کی راہ میں حائل عصری تحدیات

اس وقت مسلم معاشروں کا عمومی ماحول غیر اسلامی و ناساز گار ہے۔ اس کی اساس و بنیاد اسلامی اصولوں پر نہیں ہے۔ مغرب کے تتبع میں ہم نے فیشن اور جدت کے نام پر ہر رطب و یاس کو اپنالیا ہے۔ لہٰذا معاشرے کا عمومی ماحول اس کی اٹھان کسی طور پر ایک اسلامی معاشرے کی عکاس نہیں ہے۔ کوئی اسلامی طرزِ حیات کو اختیار کرنا چاہے تو معاشرہ خود اس میں مزاحم ہو جاتا ہے۔ دریں حالات نسل نو کی تربیت اسلامی اصولوں کے مطابق کرنا کار دشوار ہو چکا ہے۔ مسلمان پسپا ہو رہے ہیں ان کی تہذیب شکست کھا رہی ہے۔ وہ آہستہ آہستہ مغربی تہذیب میں جذب ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ ان کے دلوں اور دماغوں پر مغربیت مسلط ہو رہی ہے۔ ان کے ذہن مغربی سانچوں میں ڈھل رہے ہیں۔ ان کی فکری و نظری قوتیں مغربی اصولوں کے مطابق تربیت پا رہی ہیں۔ ان کے اخلاق، ان کی معاشرت، ان کی سیاست ہر چیز مغربی رنگ میں رنگی جا رہی ہے۔ ان کی نئی نسلیں اس تخیّل کے ساتھ اٹھ رہی ہیں کہ زندگی کا حقیقی قانون وہی ہے جو مغرب سے ان کو مل رہا ہے۔ یہ شکست دراصل مسلمانوں کی شکست ہے جسے بد قسمتی سے ان کی فتح سمجھا جاتا ہے۔[34] جہاں تک شخصیت سازی جیسے اہم ترین کام میں اس زوال و اضمحلال کے اسباب کا تعلق ہے تو اس میں کچھ خارجی عوامل اور کچھ داخلی عوامل بہت شدت سے اور غیر محسوس انداز میں کار فرما ہیں۔ ذیل میں دونوں کا تذکرہ مجملاً برائے ملاحظہ ہے:

1- خارجی تحدیات

i- عصر حاضر میں مغرب کے تصور مادیات کے زیر اثر "کامیابی" کی ایک خاص تعریف وضع کی گئی ہے۔ جس کے مطابق کامیاب فرد وہی ہے جس کے پاس وافر مال و دولت، بنگلہ گاڑی، وسائل و رسوخ، نوکر چاکر، خدم و حشم ہوں۔ معاشرے میں ایسے ہی افراد معزز و مکرم ہوتے ہیں۔ ہر جگہ ان کا اکرام کیا جاتا ہے۔ ان کی بات اثر رکھتی ہے۔ وہ اپنے مال و دولت کے بل پر دنیا کی ہ شے خرید سکتے ہیں۔ اس میں حلال و حرام، جائز و ناجائز کی تمیز بھی روا نہیں رکھی جاتی الا ماشاء اللہ۔ اور پھر کہا جاتا ہے کہ یہ تو اللہ کا فضل ہے۔ جو شخص ان معیارات پر پورا نہیں اترتا خواہ کیسا ہی متقی ہو۔ لائق و ذکی ہو اسے ناکام قرار دیا جاتا ہے۔ اسی طرح کامیابی کو چند مخصوص پیشوں اور عہدوں کے ساتھ منسوب کر دیا گیا ہے۔ اس تصور کے نتیجے میں اسی معیار کے مطابق کامیاب ہونے کی ایک دوڑ ہے جس میں ہر شخص سرپٹ بھاگ رہا ہے۔ ایک ناپختہ، معصوم ذہن کا حامل جب خود کو رد کیے جانے اور اپنے بالمقابل کسی اور کو عزت دیے جانے کے تکلیف دہ تجربے سے گزرتا ہے تو اس کے لاشعور میں "ویسا" ہی بننے کی تمنا جنم لیتی ہے جس کی اس معاشرے میں عزت ہو۔ وقت کے ساتھ ساتھ خواہش کا یہ بیج تناور درخت بن جاتا ہے اور پھر یہ بچہ جوان ہو کر جب عملی میدان میں اترتا ہے تو خود کو کامیابی کے موجودہ مقیاس کا اہل ثابت کرنے کے لیے حلال و حرام، صحیح و غلط، حق ناحق... اپنی تمام اقدار سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ دوسروں پر ظلم و زیادتی، حق تلفی و ناانصافی کرتے ہوئے الھکم التکاثر کی تصویر بنا "کامیابی" کے زینے طے کرتا چلا جاتا ہے اور جو نہیں کر پاتا وہ شدید قسم کے احساس کمتری، حسد، کینے، غضب، ناشکری جیسے جذبات کا شکار ہو جاتا ہے۔ جن کے اثرات کئی شکلوں میں ظہور کرتے ہیں۔ یعنی یا تو وہ اپنے احساس کمتری کے سبب اینگزائٹی، ڈیپریشن کا مریض بن کر ایک ناکارہ فرد کے طور پر زندگی بسر کرتا ہے یا پھر حسد کے جذبے کے تحت دوسروں کے بھی بڑے

نقصان کرتا ہے اپنا تو وہ دشمن ہوتا ہی ہے۔ یعنی شخصیت و کردار کی کجی اور بگاڑ خواہ کسی بھی صورت ہو لازماً ہوتا ہے۔ یہ زیغ فرد کے اپنے محسوسات کا نتیجہ ہے۔ ہر ماں طبعاً چاہتی ہے کہ اس کی اولاد دنیا میں کسی سے کم تر نہ ہو۔ سو وہ اسی نہج پر بچے کی تربیت کرتی ہے اس کی ذہن سازی ہی ایسے کرتی ہے کہ اسے اس ''اکھاڑے'' میں کامیابی سے اتار سکے اور وہ بھی مال وزر، عہدہ وجاہ کی اس دوڑ میں کسی سے پیچھے نہ رہے۔ اس عمل کی شروعات بچوں کے نمبروں اور گریڈز سے ہوتی ہے۔ ماں خود اپنے بچے کا دوسروں سے موازنہ کرکے اس کو ذہنی طور پر دوسروں کے مدمقابل ہونے کا تصور دے دیتی ہے۔ اسے پورا ایک نظام العمل دیتی ہے کہ اچھے نمبرز ہوں گے تو اعلیٰ تعلیم حاصل ہو سکے گی پھر اچھی ملازمت... یعنی ایک غیر مختتم سلسلہ۔ یوں وہ فرد اسی ذہن کے ساتھ پروان چڑھتا ہے کہ اسے دوسروں کو پچھاڑ کر آگے نکلنا ہے۔ 99% معاملات میں یہ مسابقت صحت مندانہ نہیں رہتی بلکہ ایک جنگ اور موت وحیات کی کشمکش کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اس سوچ کے ساتھ جس فرد کی تربیت کی جائے گی اس کی شخصیت اوصافِ حمیدہ سے متصف ہو ہی نہیں سکتی۔ کیوں کہ کامیابی کا یہ تصور ہی غلط ہے۔ ''ہم نے کامیابی کا معیار ہی غلط بنا رکھا ہے۔ ہم طاقت، شہرت، دولت، مرتبے کو کامیابی کہتے ہیں۔ کامیابی یہ تو نہیں... کامیابی مغرب کی تقلید میں نہیں۔ کامیابی تو اللہ کے حبیبؐ کے تقرّب میں ہے''۔[35]

ii- میڈیا میں اشتغال

آج کل ہر عمر کے افراد کی بڑی مصروفیت میڈیا ہے۔ کوئی فرد بھی اس کے اثرات سے محفوظ نہیں لیکن بچوں اور نوجوانوں کی زندگی میں اس کی مداخلت خوفناک حد تک ہو چکی ہے۔ گویا ایک خارجی چیز ہمارے گھروں میں افرادِ خانہ کی سی حیثیت حاصل کرکے خلوتوں کی ساتھی بن چکی ہے۔ جدید میڈیا فیس بک، ٹوئٹر، یوٹیوب.... نے ذہنی وجسمانی طور پر یوں جکڑ رکھا ہے کہ دنیا میں اور کوئی کام دکھائی ہی نہیں دیتا۔ بقول ڈاکٹر نگار سجاد ظہیر ''میڈیا کے ذریعے ذہن سازی کا کام کیا جاسکتا ہے۔ مفادات کا حصول ہو یا مخصوص نتائج کا میڈیا کے ذریعے عین ممکن ہے''۔[36] سو اس وقت ہماری نسل نو اپنے والدین اور بزرگوں سے کچھ سیکھنے کے بجائے سب کچھ اسی میڈیا سے سیکھ رہی ہے۔ اس کے ذریعے ذہنی غلامی میں ابتلاء بڑھتا جارہا ہے۔ اس کے بہت سے نقصانات ہیں۔ مثلاً

1- **مخصوص طرزِ فکر کی ترویج:** معاصر میڈیا یہود کے شکنجے میں ہے لہٰذا ساری دنیا وہی دیکھتی ہے جو وہ دکھانا چاہتے ہیں۔ مغرب کی برتری اور اپنی کم مائگی کا احساس نسل نو کو آکاس بیل کی طرح اپنی لپیٹ میں لے چکا ہے۔ ہر مفید وکارآمد رائے، چیز یا امر ہمیں انھی کا مرہونِ منت محسوس ہوتا ہے۔ اپنی علمی میراث پر فخر کے بجائے ہمیں خفت کا احساس دلانا دراصل اغیار کا خواب تھا جسے انھوں نے میڈیا کے ذریعے شرمندہ تعبیر کیا ہے اور اس کاوش میں خوب کامیاب ہیں۔

2- **اخلاقی اقدار کی موت:** میڈیا کے ذریعے مخرب اخلاق فلمیں، ڈرامے، سائٹس، لایعنی خبریں، شوبز کی چمک دمک، سیم وزر کی کھنک، اقدار کی بیخ کنی کر رہی ہے۔ لڑکیاں جھانسوں میں پھنس کر برباد ہو رہی ہیں۔

3- **غیر صحت مندانہ طرزِ حیات:** گھنٹوں گردن جھکائے سکرین کی طرف دیکھتے رہنا نظامِ بدن کو بری طرح تباہ کر دیتا ہے۔ تمام اعضاء بالخصوص جوڑ منجمد ہونے لگتے ہیں۔ معاشرے میں روزافزوں بچوں اور نوجوانوں کی بیماری کے اسباب میں ایک سبب یہ بھی ہے۔

4- **احساس کمتری:** مہنگی اشیائے صرف کے اشتہار شاہانہ تقاریب کی تصاویر سے شوق اور خواہشیں جنم لیتی ہیں۔ پھر معاشی حالات ان کی تکمیل کی راہ میں حائل ہوتے ہیں۔ نتیجتاً احساس کمتری، حسد میں اور پھر انتقام و نفرت میں مبتلا کر دیتا ہے۔ سو معاشرے میں بے راہ روی، ڈکیتیاں، چوریاں قتل تک جیسے جرائم عام ہو رہے ہیں۔ دوسری طرف نفسیاتی امراض بھی بڑھ رہے ہیں۔

5- **اپنی تہذیب سے بے گانگی:** معاصر میڈیا کے زیر اثر ہماری قوم بحیثیت مجموعی اپنی تہذیبی اقدار سے یکسر بے گانہ اور اغیار کی تہذیبوں سے متاثر ہو کر ان کے رنگ میں ڈھلتی جا رہی ہے۔

6- **وقت کا ضیاع:** پہروں اس سوشل میڈیا میں مصروف رہنے سے قیمتی وقت ضائع ہو رہا ہے۔ جو کسی مفید سرگرمی، تحصیل علم و فن میں، کسی نیک کام میں، عبادت میں، بسر ہو سکتا ہے، وہ صرف میڈیا پر لگایا جا رہا ہے۔ صبح سے شام اور شام سے صبح بس اسی طرح عمریں اور صلاحیتیں ضائع ہو رہی ہیں۔ سوشل میڈیا کے ان مضر اثرات کو اہلِ مغرب خود بھی تسلیم کر رہے ہیں اور اسے بچوں کے لیے خطرہ قرار دے رہے ہیں۔ ان کے ہاں بھی Screed addiction کے الفاظ استعمال ہونے لگے ہیں۔ ویڈیو گیمز میں مشغولیت کے نتیجے میں ہونے والے اخلاقی، معاشرتی، علمی، ذہنی و جسمانی نقصانات پر تحقیقات اور Case Studies ہو رہی ہیں اور ثابت ہو رہا ہے کہ سوشل میڈیا نہ صرف بچوں کی شخصیت کو متاثر کرتا ہے بلکہ عمدہ تربیت کی راہ میں حائل و مزاحم ہے۔ اس کے سبب بچے اپنی ماں اور اہلِ خانہ سے وابستگی ختم ہو رہی ہے۔[37] موبائل کی صورت یہ تباہی ہر شخص کے ہاتھ میں ہمہ وقت موجود ہے۔ نتیجہ یہ کہ تربیت کا سارا عمل ماں کے بجائے میڈیا ہی سے ہو رہا ہے۔ کھانے پکانے کی ترکیب ہو یا کوئی اور علمی مسئلے ہر چیز اسی کے ذریعے سیکھی جا رہی ہے اور جس طرح سیکھی جا رہی ہے اور جس طرح سکھائی جا رہی ہے اس کے پیچھے خاص محرکات ہیں۔ مثلاً یہود پروٹوکولز سے ایک مثال برائے ملاحظہ ہے:

> "... پریس کے ذریعے ہم خود پسِ پردہ رہ کر غیر یہود اقوام پر اثر انداز ہوتے ہیں... ہم غیر یہود اقوام کی تعلی کے شعبے کو خاص طور پر نشانہ بنائیں گے ان کے نصاب تعلیم کو ایسے انداز میں مرتب کریں گے کہ ان کی نئی نسل دلجمعی اور یکسوئی سے کوئی فیصلہ نہ کر پائے کبھی کسی قطعی نتیجے پر نہ پہنچ سکے اور ہمیشہ تناؤ اور کشیدگی کا شکار رہے... اس خطرے کے پیشِ نظر کہ مبادا عوام یہ اندازہ کر لیں کہ انھیں کس طرح آلہ کار بنایا گیا ہے ہم ان کی توجہ کھیل کود، تفریحات، ہوس پرستی، تماشہ گاہوں اور شان دار ہوٹلوں کی طرف موڈ دیں گے۔ ہم پریس کے ذریعے آرٹ، نمائشوں اور مختلف قسم کے سپورٹس مقابلوں کی تجاویز پیش کریں گے۔ اس نوعیت کی دلچسپیاں ان کی توجہ کو ہمیشہ کے لیے اصل مسائل سے دور رکھیں

گے۔ جب لوگ سوچ بچار کرنے اور اپنے نظریات قائم کرنے کی عادت سے عاری ہو جائیں گے تو وہ ہماری ہی زبان میں بات کرنا شروع کر دیں گے کیونکہ ہم ہی انھیں فکر کی راہیں سمجھائیں گے۔[38]

یہ مسئلہ حقیقت ہے کہ موبائل فون صرف ایک آلہ نہیں ایک تہذیب، ایک تمدّن، ثقافت، تاریخ، زبان، بیان، اسلوب اور طرزِ زندگی بھی ہے جس نے خیر و شر کے پیمانے بدل ڈالے ہیں۔ لوگوں کی خلوتوں میں گھس کر گناہ کا دائرہ وسیع کر دیا ہے۔[39] سو تربیت اور شخصیت سازی کی راہ میں میڈیا بری طرح مزاحم ہے۔

4- جدید الحاد و ارتداد

1100-1200ء کے دوران بالخصوص اس صدی کے آخری ربع میں سلطان صلاح الدین ایوبی صلیبیوں کے خلاف برسرپیکار تھے۔ مصادر میں اس عہد میں صلیبیوں کی مختلف اسلام دشمن چالوں کا تذکرہ ملتا ہے۔ ان میں ایک بہت کامیاب چال تھی: مسلمانوں، بالخصوص نوجوانوں کو اسلام سے برگشتہ کرنا اور ان کے قلوب و اذہان میں اپنے مذہب سے متعلق شکوک و شُبہات پیدا کرنا۔ بہاء الدین شداد کی یادداشتوں سے چند مثالیں پیش ہیں: شاہ آگسٹس، 1172ء میں کرک کے قلعے میں، صلیبیوں کے شعبۂ جاسوسی کے سربراہ ہرمن سے مخاطب ہے: "ہرمن تمھاری نگاہ محدود ہے تم صرف سلطان صلاح الدین اور نورالدین کو دیکھ رہے ہو۔ ہم اسلام کو دیکھ رہے ہیں۔ ہمیں اس مذہب کی بیخ کنی کرنی ہے۔ اس کے لیے کردار کشی اور نظریات میں شکوک پیدا کرنا لازمی ہے۔ مسلمانوں میں ایسی تہذیب رائج کرو جس میں کشش ہو۔ ضروری نہیں کہ یہ مقصد ہم اپنی زندگی میں حاصل کرلیں ہم یہ کام اپنی اگلی نسل کے سپرد کر دیں گے۔ کچھ کام وہ کرے گی پھر یہ مہم اس سے اگلی نسل ہاتھ میں لے لے گی۔ پھر ایک دور ایسا آئے گا جب اسلام کا نشان نہیں رہے گا اگر اسلام زندہ رہا بھی تو یہ مذہب کسی صلاح الدین ایوبی اور نورالدین زنگی کو جنم نہیں دے گا۔ میں وثوق سے کہتا ہوں کہ مذہب مسلمانوں کا اپنا ہو گا لیکن یہ ہماری تہذیب میں رنگا ہوا ہو گا۔ ہرمن آج سے سو سال بعد پر نظر رکھو ...[40] اور ایک صلیبی حاکم ریمنڈ کہتا ہے "ہمیں ان کے اصل تہذیب و تمدن بگاڑنا ہے ہم اس دور میں زندہ نہیں ہوں گے ہم دیکھ نہیں سکیں گے۔ میں پورے یقین سے کہتا ہوں کہ ہم نے کردار کی تباہ کاری کی مہم جاری رکھی تو وہ دور آئے گا کہ اسلام اگر زندہ رہا تو یہ اسلام کی بدروح ہو گی جو بھٹکتی پھرے گی۔ مسلمان نام کے مسلمان ہوں گے ان کی کوئی آزاد اسلامی مملکت رہ بھی گئی تو وہ گناہوں اور بدی کا گھر ہو گی۔[41]

مدتِ جدید بعد آج بھی یہود و نصاریٰ اسی مشن پر کام کر رہے ہیں آج زیادہ مسلّح اور خوبصورت ہتھیاروں سے لیس ہیں کہ ہم اس امر کا ادراک بھی نہیں کر پا رہے کہ تحقیق و علم کے لبادے میں امت کی شہ رگ میں کیا زہر انڈیلا جا رہا ہے۔ ہم اس سموم کو بخوشی تسلیم کیے جا رہے ہیں۔ تحریک استشراق اب اسی ایجنڈے پر کام کر رہی ہے کہ مسلم طلبا مسلم نہ رہے۔

بالفاظ سید ابوالحسن علی ندوی "کچھ عرصہ سے دنیائے اسلام کو ایسے ارتداد سے سابقہ پیش آیا ہے جس نے اس کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک لہر پیدا کر دی ہے... ملک تو ملک خاندانوں میں ایسے مشکل سے تھوڑے بہت ہوں گے جو اس کی دست برد سے محفوظ ہوں۔ یہ وہ ارتداد ہے جو شرقِ اسلامی پر یورپ کی سیاسی اور تہذیبی تاخت کے پیچھے آیا ہے۔ یہ سب سے عظیم ارتداد ہے جو عہد رسالت سے لے کر آج تک کی اسلامی تاریخ میں رونما ہوا ہے"۔[42]

آگے چل کر لکھتے ہیں

"بلاشبہ یہ ارتداد ہے لیکن مسلمانوں کی توجہ اپنی طرف مبذول نہیں کر سکا۔ کیوں؟ اس لیے کہ اس ارتداد کا مارا ہوا کلیسا یا ہیکل نہیں جاتا اور نہ اپنے ارتداد اور تبدیلی مذہب کا اعلان کرتا ہے... بدستور اسی معاشرے میں رہتا ہے اپنے تمام حقوق حاصل کرتا ہے بلکہ معاشرے پر حاوی ہونے کا بھی اس کو موقع مل جاتا ہے۔ یہ عالم اسلامی کا نہایت اہم اور بڑا قابلِ فکر معاملہ ہے۔[43]

الحاد ولادینیت کا یہ زہر سکول وکالج اور جامعات میں بسرعت پھیل رہا ہے۔ پاکستانی جامعات میں طلباء کی معقول تعداد اپنے آپ کو atheist کے نام سے متعارف کرواتی ہے۔

بلاشبہ ان سب تحدیات کے مقابلے، ان کے حل میں سارے معاشرے بالخصوص علماء، اساتذہ، اہلِ حل وعقد اور قوتِ نافذہ کے حامل اداروں سبھی کا کردار بہت اہم ہے لیکن اس عمارت کی خشتِ اوّل لگانے والی بلاشبہ ماں ہی ہے۔ اس کے فرائض اور کردار حصہ اوّل میں بیان کیے جا چکے ہیں۔

ہونا یہ چاہیے کہ صغر سنی میں ہی بچے کے دل میں اپنے رب، دین اور ایک مخصوص طرزِ حیات کا پابند ہونے کا تصور کالنقش فی الحجر کیا جائے۔ اس کی تربیت شعوری طور پر یوں کی جائے کہ اس کے ہیروز کارٹون یا فلموں کے کردار یا دنیا کے معروف کھلاڑی نہ ہوں۔ صحابہ، نامور مسلم جرنیلوں، سائنس دان، مشاہیر اسلام ہوں۔ تعلیمی اداروں اور معاشرے کے عمومی رجحانات کے گہرے اثرات شخصیت پر مرتب ہوتے ہیں۔ تاہم اگر گھر سے ایک اچھی بنیاد بنی ہو۔ گھر عبادت کا مرکز ہو پاکیزہ ہو اس میں اللہ کی کبریائی کا بھرپور تصور واحساس پایا جاتا ہو تو اس گھر میں پروان چڑھنے والا بچہ صرف اللہ سے ڈرنے والا ہو گا۔ اسے اپنے وقت کے صحیح مصرف کا علم ہو گا۔ اس کی پسند ناپسند اور ترجیحات یکسر مختلف ہوں گی۔ اور اس کے رویّے سے اس کی بھرپور عکاسی بھی ہو گی۔ تاریخ اسلام اس کی بے شمار مثالیں پیش کرتی ہے لیکن آج ہم اس کے بالکل برعکس مناظر دیکھتے ہیں۔ گھر میں ماں کے ہاتھوں تربیت کا ادارہ غیر فعّال ہے یا غیر موثر۔

معاشرے یا تعلیمی اداروں کے واضح اثرات نوجوانوں پر پڑنا تو لازم ہے لیکن المیہ یہ ہے کہ بچپن اور لڑکپن جس میں ماں کے اثرات اور گھر کی تربیت بلاشبہ زیادہ ہوتے ہیں۔ اس عمر کے بچوں میں بھی کردار کی وہ خوبیاں دکھائی نہیں دے رہیں جو اسلاف کے ہاں تھیں۔ اس کے اسباب پر غور وخوض کیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ ان خارجی عوامل کے محاذ پر ماں کو جس طرح تیار ہونا چاہیے اس طرح وہ تیار نہیں ہے سینہ سپر نہیں ہے۔ بآسانی مشاہدہ کیا جا سکتا ہے کہ شخصیت سازی میں ماں کے مطلوبہ کردار کے فقدان کے اسباب میں خارجی عوامل و تحدّیات کے ساتھ ساتھ چند داخلی کمزوریاں بھی شامل ہیں۔ گویا کچھ تحدیات خالصتاً داخلی سطح پر ہیں اور ان کمزوریوں کا خاتمہ ماں کو اپنی سطح پر محرّک وفعّال ہو کر شعوری کوشش وکاوش سے ہی کرنا ہو گا۔ ذیل میں چند ایسی داخلی تحدیات مذکور ہیں۔

1- ماں کا تصور عبدیت درست نہیں

ماں راع کے صحیح تصور ہی سے نا آشنا ہے۔ وہ اس کے ابعاد و جہات سے لاپرواہے۔ وہ یہ ادراک ہی نہیں کر پارہی کہ بچے کو صرف کھلانا، پلانا اور پہنانا پھر سکول بھیجنا اور نصابی کتب پڑھا دیناہی اس کا فریضہ نہیں بلکہ اس کے جسم و ذہن دونوں کی ایک باغبان کی مانند کانٹ چھانٹ کرنا اس کی ذمہ داری کا جزولاینفک ہے۔ تاکہ یہ بچہ جب عہد شباب پہنچے تو ایک خود رو پودے کی طرح نہ ہو بلکہ پوری توجہ سے سینچا گیا شجر ہو جس کا سایہ بھی ہو اور ثمر بھی۔

المیہ یہ ہے کہ آج کی ماں امانت کے اصل تصور سے بے نیاز ہے لہٰذا نہ وہ اپنی صحت کا خیال رکھتی ہے نہ اسے اپنے وقت کی اہمیت اور اس کے صحیح مصرف کا احساس ہے۔ بالاختصار بات کریں تو ماں کا اپنا تصور عبدیت ہی واضح نہیں ہے۔ عہد فاروقیؓ کا ایک مشہور واقعہ اس امر پر کافی و شافی دلالت کرتا ہے کہ ماں کا تصور عبدیت واضح ہونا اسلاف کے ہاں کتنا اہم تھا اور اس کے نتائج و ثمرات کیا تھے۔ واقعہ کچھ یوں ہے:

> ایک رات حضرت عمرؓ حسبِ معمول گشت کر رہے تھے۔ ایک گھر سے انھیں ماں بیٹی کا مکالمہ سنائی دیا۔ ماں بیٹی سے کہہ رہی تھی کہ دودھ میں پانی ملا دے۔ بیٹی نے کہا: حضرت عمرؓ نے اس عمل سے منع فرمایا ہے۔ ماں نے کہا عمرؓ ہمیں دیکھ تو نہیں رہے۔ بیٹی بولی اماں اگر عمرؓ نہیں دیکھ رہے تو اللہ تو دیکھ رہا ہے۔ حضرت عمرؓ نے جو اس گھر کی دیوار سے پشت لگائے کھڑے تھے، اپنے خادم اسلم سے کہا اس گھر کی شناخت رکھنا۔ صبح ہوئی تو خادم کو بھیج کر اس لڑکی کا پتہ کرایا۔ پتہ چلا کنواری ہے تو اپنے بیٹے عاصم کا نکاح اس سے کر دیا۔[44]

انھی عاصم کے ہاں وہ بیٹی پیدا ہوئی جس کو اللہ نے عمرؒ بن عبد العزیز کی والدہ بنایا۔ یہ سوچ کہ اس کو بہو بنایا جائے اس کے کردار، دیانت اور عبدیت کے صحیح تصور کے سبب حضرت عمرؓ کے ذہن میں آئی۔ اور ان کا قیاس درست ثابت ہوا کیونکہ ان کے نواسے عمر ثانی کہلائے۔ صالحہ ماں ہی صالح اولاد کو پروان چڑھا سکتی ہے۔

2- مستقبل کے کسی واضح نقشے یا خاکے کی عدم موجودگی

معاصر ماں خود ہی vision سے عاری ہے۔ اس کے پاس اولاد کے لیے سوائے اس کے کوئی وژن نہیں کہ وہ ڈاکٹر، انجینئر یا IT کا ماہر بن جائے اور خوب پیسہ کما سکے۔ کامیابی بس یہی ہے۔ ان تصورات کے ساتھ پالے گئے بچے کا اپنا Vision کیا ہو گا بآسانی تصور کیا جا سکتا ہے۔ بلکہ معاشرے کا کم و بیش ہر فرد اس کی تصویر بنا ہوا ہے۔

تاریخ ایسی ماؤں کی خوب صورت تصاویر محفوظ کیے ہوئے ہے جن کے ذہنوں میں بچوں کے مستقبل کی واضح تصویر ہوا کرتی تھی۔ انھیں بخوبی علم ہوتا تھا کہ اس بچے کو کس مقصد کے تحت زندگی بسر کرنا ہے۔ مثلاً قرآن کریم میں حضرت مریمؑ کی والدہ اللہ کے حضور دست بدعا دکھائی دیتی ہیں: رَبِّ اِنِّی نَذَرتُ لَکَ مَا فِی بَطنِی مُحَرَّرًا[45]

اللہ نے بیٹے کے بجائے بیٹی سے نواز دیا وہ پھر اس بیٹی کو بھی اللہ کے حکم سے اس کے نام پر وقف کر دیتی ہیں۔ اسی طرح ایک غزوے کی تیاری کا مرحلہ چلا رہا ہے۔ آنجنابؐ نے سبھی صحابہ کو حکم دیا کہ حسب توفیق تیاری میں اپنا اپنا حصہ ڈالیں۔ جس کے

پاس جو بھی میسر تھا وہ حضورؐ کی خدمت میں پیش کر رہا تھا۔ اسی دوران ایک صحابیہ آئیں جن کے پاس ایک چھ ماہ کا بچہ تھا۔ انھوں نے نبیؐ کریم کی خدمت میں عرض کیا: "یارسول اللہؐ میری طرف سے یہ بچہ قبول فرمالیں"۔ آپؐ نے فرمایا ہم اس کا کیا کریں گے آپ اپنے پاس رکھیں۔ تو عرض کیا "یارسول اللہؐ جب آپؐ کی طرف کوئی تیسر آئے گا تو اسے ڈھال بنالیجیے گا" یعنی ان کے ذہن میں اپنے بچے کی زندگی کا مقصد واضح تھا کہ اسے راہ الٰہی میں استعمال ہونا چاہیے خواہ کسی بھی صورت میں ہو سکے۔

3- معاشی سرگرمیاں

معاصر ماؤں کا بڑا المیہ یہ ہے کہ مالی طور پر مستحکم ہونے کی خواہش نے انھیں کسب معاش کے میدان میں لا اتارا ہے۔ ماں نے اس دائرہ عمل کو جسے قدرت نے اس کے لیے منتخب کیا تھا، سے تجاوز کرتے ہوئے اپنی ذمہ داریاں بڑھالی ہیں۔ گو اس میں کسی حد تک ضرورت کا عنصر بھی بلاشبہ موجود ہے لیکن عصری مغربی ڈھانچے کے مطابق، معیارِ زندگی کو بلند کرنے کی سعی و کاوش میں معاصر مائیں نام نہاد ترقی کی دوڑ میں سرپٹ شامل ہو گئی ہیں۔ گویا اب اس کو اپنی ملازمت کی ذمہ داری بھی نبھانی ہے اور گھریلو امور بھی انجام دینے ہیں۔ اس دُہرے بوجھ تلے وہ دبتی چلی جاتی ہے۔ دریں صورت اس کے پاس بچوں کی تربیت کا وقت ہی نہیں نہ جسمانی سطح پر اور نہ ذہنی سطح پر۔ وہ ان کی ضروریاتِ زندگی، کھانا پینا اوڑھنا پہننا ہی وقت پر کر پائے تو غنیمت ہے۔ عام مشاہدے کی بات ہے کہ اکثر مائیں بچوں کو بازاری کھانوں، خاص طور پر اسنیکس اور بیکری مصنوعات کھلا کر وقت گزار رہی ہیں۔ تربیت، جس کے نتیجے میں شخصیت کی تہذیب ہوتی ہے اور یہ ایک کل وقتی ذمہ داری ہے، کی گنجائش ہی کہاں بچتی ہے۔ اس کا بھیانک نتیجہ یہ ہے کہ اگلی نسلیں قوم کے بجائے افراد کا ایک بے ہنگم ہجوم بنتی جا رہی ہیں۔ جدید تحقیقات سے ثابت ہو چکا ہے کہ جو مائیں گھر پر کل وقتی ذمہ داری انجام دیتی ہیں، ان کے بچوں کی پرورش اچھی ہوتی ہے۔ بچے تنہائی کے احساس، چڑچڑے پن اور غصّے جیسی کیفیات سے محفوظ و مامون رہتے ہیں بصورت دیگر یہ احساسات بچے کی شخصیت میں در آتے ہیں۔ عورت کا اس پر قناعت نہ کر سکنا کہ مرد کما کر لائے اور خاندان کی ضروریات اسی میں پوری ہوں، اس کے بچوں کی شخصیت میں عمر بھر کے لیے کمزوریاں پیدا کر رہا ہے۔ انواع و اقسام کی نفسیاتی بیماریوں کے پس پشت یہی ذہنی ناآسودگی کارفرما ہوتی ہے، جس کی جڑ بچپن میں ہے۔

یہی وجہ ہے کہ چین، جس نے 1990ء کی دہائی میں خواتین کی بڑی تعداد کو آزادی کے نام پر ملازمت، محنت و مشقت کی بھٹی میں جبراً جھونکا تھا۔ سرکاری میڈیا نے 2017-2016ء میں عوامی آگہی کی مہم چلائی جس میں بتایا گیا کہ "خواتین کا گھر میں رہنا نہ صرف بچوں کی افزائش، نشوونما اور تعلیم و تربیت کے لیے مفید ہے بلکہ خاندان کے استحکام کا بھی باعث ہے اور پورے معاشرے پر اس کے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اسی مہم کے دوران پوسٹرز کے ذریعے بتایا گیا کہ اچھی ماں بننا خواتین کے لیے سب سے بڑی کامیابی ہے۔[46]

ماں کا سوشل میڈیا پر اشتغال

یہ امر محتاج بیان نہیں کہ خواتین خود ٹی وی اور موبائل پر اس قدر مصروف ہیں کہ ان کے پاس بچوں کو دینے کے لیے بالکل وقت نہیں ہے۔ جب بچے کو ماں کی قربت ہی نصیب نہیں تو شخصیت سازی کیسے ممکن ہو گی۔ بچہ جب بھی ماں کی توجہ اور وقت

چاہتا ہے وہ اپنی جان چھڑانے اور اسے مصروف کرنے کے لیے موبائل یا ویڈیو گیمز تھما دیتی ہے۔ خواہ اسے گھریلو کام کرنے ہوں یا پھر اس کی اپنی سوشل میڈیا پر محیط تفریح میں خلل آرہا ہو۔ ماں کو چونکہ خود ڈرامے، فلمیں، دیکھنی ہوتی ہیں۔ شوبز ستاروں سے متعلق معلومات رکھنا، کہاں سیل لگی ہے؟ اس کا علم رکھنا، فیس بک کے جدید رجحانات اور نہ جانے کیا کیا... پھر لمحہ بہ لمحہ اپنا سٹیٹس اپ ڈیٹ کرنے لوگوں کے سٹیٹس دیکھنے پھر اس پر پسند ناپسند (like, dislike) کا مرحلہ... غرضیکہ مصروفیات کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے۔ جو وقت اور توجہ کا متقاضی ہے ایسے میں بچوں کو کیا وقت دیا جاسکتا ہے! بقول امام غزالیؒ "تربیت کی مثال بالکل اس طرح ہے جیسے کسان کھیتی باڑی کے دوران اپنی فصل سے غیر ضروری گھاس اور جڑی بوٹیاں نکال دیتا ہے تاکہ فصل کی ہریالی اور نشوونما میں کمی نہ آئے"۔[47] جو ماں خود Screen Addiction کا شکار ہے۔ نت نئی اشیاء کی تصاویر و اشتہارات دیکھ کر ان کے حصول کی خواہش میں اور کوشش میں مگن ہے، جو خود معاشرے میں بہتر اور برتر نظر آنے کی دوڑ میں شامل ہے اس کی بھلا بچے کی شخصیت کی اٹھان پر کیا نظر ہوگی! صدیوں سے یہ عام مشاہدے میں ہے کہ افراد تاعمر وہ ہی کام، جو بسا اوقات مبنی بر جہالت ہوتے ہیں، کرتے رہتے ہیں اور اس کی توجیہ یہ کرتے ہیں کہ انھوں نے اپنے والدین، بالخصوص ماں کو ایسا ہی کرتے دیکھا ہے۔ یہ سلسلہ نسل در نسل چلتا رہتا ہے۔[48]

اختتامیہ

متقدمین ہوں یا معاصرین ہر عہد کے دانش وروں کی رائے یہی ہے کہ ایک فرد کی شخصیت، اس کے رویے اور کردار کی تشکیل کا آغاز نہ صدر مملکت کر سکتا ہے نہ امام مسجد، نہ سکول کا استاد، نہ میڈیا... یہ کام کرنے والی اوّلین ہستی ماں کی ہے۔ رویوں اور مزاج کی تہذیب عدالت نہیں کر سکتی ماں کر سکتی ہے۔ مسلم ماں کا فریضہ ہے کہ اس اسلام مخالف، ارتداد و الحاد اور اسلام بیزاری کی فضاء میں قرآن و سنت کے عین مطابق بچوں کی شخصیت سازی کرے۔ انھیں زندگی کے حقیقی اور اعلیٰ مقاصد سے روشناس بھی کرائے اور ان کے لیے تیار بھی کرے جو خالق نے خود طے کیے ہیں۔ جو انسان ایک باعمل مسلمان ہوگا وہ طبعاً اچھا انسان ہوگا۔ اخلاقیات کے اعلیٰ مقام پر فائز ہوگا۔ مذکورہ بالا معروضات کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے بلاخوف تردید و ابطال کہا جاسکتا ہے۔ بچیوں کی تربیت پر بہت زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ انھیں اس فطری وظیفے کو پیشِ نظر رکھ کر پروان چڑھانا لازمی ہے جو قدرت نے ان کو سونپا ہے لامحالہ وہ انھیں ادا کرنا ہی ہے۔ جس سے نسلیں یا تو سدھرنی ہیں یا بگڑنی ہیں۔ لہٰذا ضروری ہے مستقبل کی ماؤں کی صحیح تربیت کی جائے نیز سکولوں، کالجوں اور جامعات میں نیز سوشل میڈیا پر ایسی آگاہی مہمات چلائی جائیں جو خواتین کو ان کی اصل ذمہ داریوں کی طرف راغب کریں اور موجودہ لایعنی سرگرمیوں سے چھٹکارا پانے میں ان کی رہنما، معاون اور حوصلہ بخش ثابت ہوں۔ کیونکہ ماحول بہت اثر رکھتا ہے۔ ہوا ذہن سازی میں بہت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ تبدیلی کے لیے ماحول کی، ہوا کی اصلاح اور اس کی کڑی نگرانی بہت ضروری ہے۔[49]

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

حوالہ جات

1 وحید الدین خان، **عورت معمار انسانیت**، دار التذکیر لاہور 2005، (ص:47)

Waheed ud-Dīn Khān, Aurat Me'mār-e- Insāniat, (Lahore: Dār at-Tazkīr, 2005), p: 47.

2 **اردو لغت تاریخی اصول پر**، اردو لغت بورڈ (ترقی اردو بورڈ)، کراچی، 1991ء، (12/520)

Urdū Lughat Tārīkhī Usūl Per, (Karāchi Tarraqī Urdū Board, 2001), 12/520, s.v.

3 بخاری ابو عبد اللہ محمد بن اسمٰعیل، **الجامع الصحیح مشمولہ موسوعہ الکتب الستۃ**، ریاض: دار السلام، 2000ء، (ح:893)

Bukhārī abū 'Abdullah Muhammad bin Ismā'īl, al-Jāmi 'aṣ.Ṣahīh, in Maus'ūa al-Kutub as-Sitta, Riyādh, Dār as-Salām 2000, H: 893

4 الھیثمی علی بن ابی بکر، مجمع الزوائد و **منبع الفوائد**، مطبع انصار دہلی ۱۳۰۷ھ، ح:9067، (5/288)

al-Haithamī 'Alī bin abī Bakr, Majma' az-Zawāid, Maṭba' Anṣar Dehlī, 1307 AH, (H: 9067).

5 الزبیدی محمد مرتضیٰ، **تاج العروس**، کویت، م ن، طبع اوّل، 2001ء، بذیل مادہ

Az-Zabidi Muhammad Murtaza, Taj-ul-Uroos, Kuwait, n.d. 1st ed. 2001, S.V.

6 التحریم:6

at-Taḥrīm: 6

7 مودودی ابو الاعلیٰ سید، **ترجمہ قرآن**، ص:99۔101

Maudūdī abū al-'Ala Syed, Tarjma-e-Qur'an,p: 99-101,

8 الذریٰت:56

az-Zāriyāt: 56

9 البقرۃ:133

Al-Baqara: 133

10 مودودی ابو الاعلیٰ سید، **تفہیم القرآن**، (15/)

Maudūdī, Tafhīm al-Qur'ān, (15/)

11 البقرۃ:132

al-Baqara: 132

12 ابو الحسن علی ندوی، **آئندہ نسلوں کے اسلام کی ضمانت اور ایمان کی حفاظت** صدیقی ٹرسٹ، س ن، (28)

Abū al-Ḥasan 'Alī Nadwi, Aā'inda Naslaun Kay Islam Ki Zamānat aur Imān Kī Ḥifāzat, Siddiqī Tust, n.d., (28)

13 شحاتہ صقا، **الموسوعۃ المیسرۃ**، دار الخلفاء الراشدین، الاسکندریہ س ن، (40)

Shaḥāta Saqqā, al-Mawsu a al-Mayassa rah fī Tarbiyat au-Awlād, al-Iskanderiya, Dār al Khulafā ar-Rāshidīn, n.d., (40).

14 البانی ناصر الدین، **سلسلۃ الصحیحۃ**، مکتبہ المعارف للنشر والتوزیع، ریاض 1995ء، 3/432

Albānī Nāṣir ud-Dīn, Silsilah as-Sahiha, Riyādh, Maṭba‘ al-Ma‘ārif li-Nashr wa-Tawzī‘, 1995, (3: 432)

15 شحاتہ صقا، **الموسوعۃ المیسرۃ فی تربیۃ الاولاد**، ص:40

Shaḥāta Saqqā, al-Mawsū‘a, p: 40

16 ندوی ابوالحسن علی، **کاروانِ زندگی**، مکتبہ اسلام لکھنؤ، طبع سوم، 2000ء، (1/81)

Nadwi abu al-Hasan ‘Ali, Karwan-e-Zindagi, Lukhnao, Maktaba-e-Islam, 3rd. ed. 2000, (1: 81)

17 ایضاً (1/81۔82)

Ibid, (1: 81-82)

18 عبدالحق، **مطالعہ سرسید احمد خان**، الرائیس ٹریڈرز لاہور، س ن، (ص:96۔97)

Abdul Ḥaq, Muṭāla‘-e- Sir Syed Aḥmed Khān, Lahore al-Rais Traders, n.d., (96-97)

19 ڈ. مقبول ارشد، **مشہور لوگوں کی عظیم مائیں**، حق پبلی کیشنز لاہور، 2002ء، (ص:104)

Maqbūl Arshad, Dr., Mashhoor Logon Ki ‘Aẓīm Mā’aīn, Lahore, Haq Publications, 2002, (404)

20 ڈ. عبدالغنی عبود، **فی التربیۃ الاسلامیہ**، قاہرہ دارالفکر العربی، طبع اوّل، 1991ء، (12/2)

‘Abdul Ghanī ‘abūd, Dr, Fī Tarbiyat ul-Islāmīya, Qāhira Dār al-Fikr, al-‘Arabī, 1st ed. 1991, 2: 12

21 شحاتہ صقا، **الموسوعۃ المیسرۃ**، ص51۔52

Shaḥātta Saqqā, al-Mausū‘a, (51-52)

22 ابن حجر شہاب الدین ابوالفضل احمد بن علی، **الاصابۃ فی تمییز الصحابہ**، دارالکتب الازہر 1983ء، (5:3)

Ibn Ḥajar Shihāb and Dīn abū al-Faḍl Ahmad bin ‘Alī, al-Iṣāba fī Tamyīz as-Ṣaḥāba, Dār al-Ktb al-Azhar, 1983 (3:5)

23 زکریا شربینی ویسری صادق، **تنشیۃ الطفل**، قاہرہ 2000ء، (ص46)

Zakarīyā Sharbīnī wa Yasrī Ṣādiq, Tunshi’at-tu-Ṭifl, Qāhira, 2000, (103-106).

24 ایضاً، ص:42

Ibid, p: 42

25 غزالی ابوحامد، **احیاء العلوم الدین (59:4)**

Ghazali Abu Hamid, Iḥyā al-‘Ulūm ad-Dīn,

26 لیلیٰ بنت عبدالرحمٰن، **کیف تربی ولدک**، (س ن، م ن)، ص:11

Laila bint ‘Abd ar-Raḥmān, Kaifa Turrabī Waladika, (N.d., NP), p:11

[27] ابو الحسن علی ندوی، **کاروانِ زندگی**(1/82-83)

abu al-Hasan Ali Nadwi, Karwaan-e-Zindagi, 1: 82-83

[28] ابو داؤد سلیمان بن الاشعث، **سنن**، مشمولہ موسوعہ الکتب السّتہ، دارالسلام ریاض، 2000ء، ح:3544

Abū Dāūd Sulayiman bin al-Ash‘ath, Sunan, in Maus‘ūa al-Kutab as-Sitta, Riyādh Dar as-Salām 2000, H: 3544.

[29] ڈ. احمد رجب الاسمر، **النبی العربی**، دارالفرقان اردن، 2001، (ص103۔106)

Aḥmed Rajab al-Asmar, An-Nabi al-Arabi, Urdan Daar al-Furqaan, 2001, p: 103-106

[30] ابن سعد محمد بن سعد بن منیع، **الطبقات الکبری** ، قاہرہ: مکتبہ الخانجی، طبع اوّل 2001ء(10/385)

Ibn S‘ad Muḥammad, aṭ-Ṭabaqat al-Kubrā, Qāhira Maktaba al-Khānjī, 1st ed. 2001), 10: 285

[31] ابن الجوزی عبد الرحمٰن بن علی، **المنتظم فی تاریخ الملوک والامم**، دارالکتب العلمیہ بیروت، طبع اوّل 1992ء، (4/174)

Ibn al-Jawzī ‘Abd ar-Raḥmān bin ‘Alī, al-Muntazim fī Tarīkh al-Malūk wa al-Umam, Dār al Kutub al-‘Arabī Beirūt, 1st ed. 1992 (4: 172)

[32] ابن الاثیر علی بن الکرم، **الکامل فی التاریخ**، دارالکتاب العربی بیروت، 2012ء، (3/401-406)۔ نیز دیکھیے مثلاً ابن الجوزی المنتظم فی تاریخ الملوک (6/140)

Ibn al-Aasīr ‘Ali bin al-Karam, al-Kāmil fī at-Tarīth, Dār al-Kitāb al-Arabī Beirut 2012), 3: 401-406, Ibn al-Jawzī, al-Muntaẓim, 6: 140

[33] علی جواد زیدی، **ہماری قومی شاعری**، اتر پردیش اکیڈمی، لکھنؤ، 1998ء

‘Alī Jawād Zaidī, Hamārī Qawmī Shā‘iri, Lucknow 1998

[34] مودودی ابو الاعلیٰ، **تنقیحات**، اسلامک پبلیکیشنز، لاہور 2006ء (32-33)

Maudūdī abū al-‘Ala, Tanqīḥāt, Islamic Publications Lahore, 2006,(32-33)

[35] واصف علی واصف، قطرہ قطرہ قلزم، کاشف پبلیکیشنز، لاہور، ۱۹۹۹ء، (74)

Wāṣif ‘Alī Wāṣif, Qaṭra Qaṭra Qulzam, Kashif Publications Lahore, 1999, (74)

[36] نگار سجاد ظہیر، الایام، **مجلس برائے تحقیق اسلامی تاریخ وثقافت** کراچی، ج:1، شمارہ:2، جولائی۔ دسمبر، 2010ء (9-10)

Nigār Sajjād Zahīr, al-Ayyām, Majlis baraey Tahqīq Islāmī wa Tarīkh wa Saqāfat Karachi 2010, (V:1, p: 2, 9-10)

[37] Amy B. Jordan and Daniel Romer, Media and the Well-Being of Children and Adolescents, Oxford University Press, 2014, (112)

مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: فہمی النجار، **اسلام اور ذرائع ابلاغ**، ادارہ معارفِ اسلامی لاہور، س ن، مترجمہ ڈاکٹر ساجد الرحمٰن صدیقی، (39)

For details, see: Fahmī an-Najjar, Islām aur Zarā'i Iblāgh, Idāra Ma'ārif Islāmī, Lahore, n.d., Tr. By: Dr. Sājid ar-Raḥmān Ṣiddiquī, (39)

[38] وکٹر ای مارسڈن، **یہودی پروٹوکولز**، ت: محمد یحییٰ خان نگار شات لاہور 2019ء، (181)

Victor E. Marsden, The Protocols of the Learned Elders of Zion, Tr. by. Muḥammad Yaḥya Khān, Nigārishāt Lahore, 2019, (181)

[39] خالد جامعی، **"موبائل فون۔ مضرات و نقصانات"**، در البرھان، جنوری 2011ء، (50 بعد)

Khalīd Jam'ī, "Mobile Phone-Muddirāt wa Nuqsānāt" in al-Burhān, (January 2011), p: 50

[40] التمش، **داستان ایمان فروشوں کی**، لاہور، حکایت پبلشرز، 2019ء (2/12)

alTamash, Dāstān Iman Faroshon Kī, Ḥikāyat Publishers, Lahroe, 2019 (1/226-227)

[41] ایضاً، (3/411)

Ibid, (3/411)

[42] ابو الحسن علی ندوی سید، **نیا طوفان اور اس کا مقابلہ**، مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ، 2009ء (8-9)

Abū al-Ḥasan 'Alī Nadwi, Nayā Toufān aur Uska Muqābla, Majlis Taḥqīqāt wa Nashriyāt Islam Lueknow, 2009, (8-9)

[43] ایضاً، (ص 12-13)

Ibid, (12-13)

[44] عبد اللہ بن عبد الحکم، **سیرۃ عمر بن عبد العزیز**، عالم الکتب س ن، (24)

'Abdullah bin al-Hikam, Sīrat 'Umar bin 'Abdul 'Azīz, Alam al-Kutub n.d., 24

[45] آل عمران: 35

Al-'Imrān: 35

[46] وحید مراد، **"عورت، ملازمت اور ماں"** در ترجمان القرآن، لاہور 2020ء، نومبر، (ص 10)

Wahīd Murād, "Aurat, Mulāzimat aur Mān" in Tarjumān al-Qur'ān, Lahore Nov. 2020, (10)

[47] ابو حامد الغزالی، **ایھا الولد**، مکتبہ الخدمات الحدیثہ، 1414ھ، (ص 37)

Abū Ḥāmid al-Ghazālī, Ayyuha al-Walad, P.N. Maktaba al-Khidmat al-Haditha 1414 A.H.(37)

[48] لیلیٰ بنت عبد الرحمٰن، **کیف تربی ولدک**، س ن، (7)

Laila bint abd-ar-Rahman, Kaifa Turabbī Waladika, (7)

[49] ابو الحسن علی ندوی، **حضرت مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی دعوت**، لاہور، (219)

Abū al-Ḥasan 'Ali Nadwī, Ḥazrat Maulānā Muḥammad Ilyās aur in Kī Dīnī Da'wat, Lahore (219)